گانے والیاں بلائی جاتیں۔ان کی خاطر و مدارت کا بار بھی اسی پر تھا۔کبھی کبھی وہ مستورات کے ساتھ ندی اشنان کرنے جاتی۔تانگے کا کرایہ اور ناشتہ کا خرچ اسی کے متھے جاتا۔اسی طرح سوتین روز اڑ جاتے تھے۔رما جان نثار شوہر تھا۔جالپا کے قدموں پر اپنی جان تک صدقے کر دیتا۔روپیہ کی حقیقت کیا تھی، اس کا منہ تاکتا رہتا تھا۔

ایک بار مستورات کو سینما دیکھنے کی دھن سوار ہوئی۔اس میں انہیں مزا آیا کہ آئے دن سینما کی سیر ہونے لگی۔رما کو اب تک سینما کا شوق نہ تھا۔شوق ہوتا بھی تو کیا کرتا۔اب ہاتھ میں پیسے آنے لگے۔اس پر جالپا کا اصرار، پھر بھلا وہ کیوں نہ جاتا۔سینما ہال میں ایسی کتنی ہی عورتیں نظر آتیں، جو منہ کھولے بے حجاب ہنستی بولتی رہتی تھیں، مگر حجاب کے باعث پردہ نشینوں کے ساتھ ہی بیٹھتی۔اس کا جی چاہتا تھا کہ رما بھی اس کے ساتھ بیٹھے۔آخر وہ ان فیشن ایبل عورتوں سے کس بات میں کم ہے۔روپ رنگ میں کم نہیں۔سج دھج میں کم نہیں۔پھر وہ پردے والیوں کے ساتھ کیوں بیٹھے۔رما بہت تعلیم یافتہ ہونے پر بھی دور جدید کے اثر سے آزاد خیال تھا۔پہلے تو وہ پردے کا ایسا حمایتی تھا کہ ماں کو کبھی گنگا اشنان کرنے لے جاتا تو پنڈتوں تک سے نہ بولنے دیتا۔کبھی ماں کی ہنسی مردانے میں سنائی دیتی تو آ کر بگڑتا، تم کو ذرا بھی شرم نہیں اماں۔باہر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں اور تم ہنس رہی ہو۔ماں شرما جاتی تھی، مگر عمر کے ساتھ رما کا وہ حجاب غائب ہوتا جاتا تھا۔اس پر جالپا کا شگفتہ حسن اسے اور بھی دلیر بنا رہا تھا۔جالپا بدوضع، بدشکل یا بدتمیز ہوتی تو اسے وہ زبردستی پردے میں بٹھاتا۔اس کے ساتھ سیر کرنے میں اسے شرم آتی۔جالپا جیسی

بے مثل حسینہ کے ساتھ سیر کرنے میں لطف کے ساتھ ہی کچھ وقار بھی تھا۔ وہاں کے مذہبی طبقے میں کوئی نازنین اتنی قبول صورت، اتنی خوش ادا، اتنی خوش قامت نہ تھی۔ دیہات کی لڑکی ہونے پر بھی وہ شہریت کے رنگ میں ایسی رنگ گئی تھی گویا شہر میں ہی اس کی پرورش ہوئی ہے۔ تھوڑی سی انگریزی تعلیم کی تھی، وہ رما پوری کیے دیتا تھا۔

مگر پردے کی بندش ٹوٹے کیسے؟ سینما ہال میں رما کے کتنے ہی دوست، کتنے ہی شناسا بیٹھے نظر آتے تھے۔ وہ اسے جالپا کے ساتھ بیٹھے دیکھ کر کتنا مضحکہ اڑائیں گے۔ کتنے فقرے کسیں گے۔

آخر ایک دن اس نے سب کے سامنے خم ٹھونک کر کھڑے ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جالپا سے بولا۔ ''آج ہم تم سینما گھر میں ساتھ بیٹھیں گے۔''

جالپا کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ بولی۔ ''سچ؟ نہیں بھائی ساتھ والیاں زندہ نہ چھوڑیں گی۔''

رما: ''اس طرح ڈرنے سے تو کچھ نہ ہوگا۔ یہ کیا مذاق ہے کہ عورتیں منہ چھپائے چق کی آڑ میں بیٹھی رہیں۔'' اس طرح یہ معاملہ بھی طے ہو گیا۔ دو چار دن دونوں کچھ جھینپتے رہے، لیکن پھر ہمت کھل گئی۔ یہاں تک کہ رما اور جالپا شام کے وقت پارک میں ساتھ ساتھ ٹہلتے نظر آنے لگے۔

ایک دن جالپا نے مسکرا کر کہا۔ ''کہیں بابو جی دیکھ لیں تو؟''

''تو کیا؟ کچھ نہیں۔''

''میں تو مارے شرم کے گڑ جاؤں۔''

''ابھی تو مجھے بھی شرم آئے گی۔ مگر وہ خود ادھر نہ آئیں گے۔''

''اور کہیں اماں دیکھ لیں تو؟''

''اماں سے کون ڈرتا ہے۔ دو دلیلوں میں سب ٹھیک کر دوں گا۔''

دس پانچ دن میں اس نئی سوسائٹی میں اپنا رنگ جما لیا۔ اس نے اس دائرے میں کچھ اس طرح قدم رکھا جیسے کوئی باکمال مقتدر پہلی بار منبر پر آتا ہے اور نقادان ناہمدرد ہونے پر بھی اس کے کمال کے آگے سر جھکا دیتے ہیں۔ جالپا کے حسن میں وہ تمکنت، وہ خودداری تھی، جو عالی نسبی کی دلیل ہے۔ پہلے ہی دن ایک خاتون نے جالپا کو چائے کی دعوت دی اور جالپا نے خواہش نہ ہونے پر بھی اسے قبول کر لیا۔

جب دونوں آدمی وہاں سے لوٹے تو رما نے متفکرانہ انداز سے کہا۔ ''تو کل اس کی چائے پارٹی میں جانا پڑے گا۔''

''تو کیا کرتی! انکار کرتے بھی تو نہ بنتا تھا۔''

''تو سویرے تمہارے لیے ایک اچھی سی ساڑھی لا دوں؟''

''میرے پاس تو ساڑھیاں ہیں۔ ذرا دیر کے لئے پچاس ساٹھ روپے خرچ کرنے سے کیا فائدہ؟''

''تمہارے پاس اچھی ساڑھی کہاں ہے؟ جیسی اس کی ساڑھی تھی۔ ویسی ہی میں بھی لاؤں گا۔''

''مجھے صاف کہہ دینا چاہیے تھا کہ میں نہیں آ سکتی۔''

''پھر اس کی دعوت بھی تو کرنی پڑے گی؟''

''یہ تو بڑی مصیبت گلے پڑی۔''

''مصیبت تو کچھ نہیں ہے۔ صرف یہی خیال ہے کہ میرا مکان بے مصرف ہے۔ میز کرسیاں چائے کا سٹ تو رمیش کے یہاں سے مانگ لاؤں گے، لیکن گھر کے لیے کیا کروں؟''

''کیا یہ ضروری ہے کہ ہم بھی اس کی دعوت کریں؟''

رما نے اس جملے پر کچھ التفات نہ کیا۔ اسے جالپا کے لیے ایک خوبصورت کلائی کی گھڑی اور ایک ساڑھی کی فکر پیدا ہوگئی۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ اس کا خرچ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ ابھی تک صرافوں کو ایک پیسہ دینے کی بھی نوبت نہ آئی تھی۔ ایک بار گنگو نے اشارے سے تقاضا بھی کیا تھا، لیکن یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ جالپا پھٹے حالوں چائے پارٹی میں جائے۔ رات بھر تو اس نے صبر کیا۔ دوسرے دن دونوں چیزیں لا کر ہی دم لیا۔

جالپا نے جھنجھلا کر کہا۔ ''میں نے تمہیں منع کیا تھا۔ ڈیڑھ سو سے کم کی نہ ہوں گی۔''

''ڈیڑھ سو، اتنا فضول خرچ میں نہیں ہوں۔''

''ڈیڑھ سو سے کم کی یہ چیزیں نہیں ہیں؟''

رما نے جالپا کی کلائی پر گھڑی باندھ دی اور فریفتہ ہو کر بولا۔ ''تمہاری کلائی! یہ کیسی کھل رہی ہے؟ میرے روپے وصول ہو گئے۔''

''سچ بتاؤ، کتنے خرچ ہوئے؟''

''سچ بتا دوں۔ ایک سو پینتیس روپے۔ پچھتّر روپے کی ساڑھی، دس کے

جوتے اور پچاس کی گھڑی۔''

جالپا ملول ہو کر بولی۔ ''وہ ڈیڑھ سو ہی ہوئے مگر یہ سب روپے ادا کیسے ہوں گے۔ اس چڑیل نے ناحق مجھے دعوت دے دی۔ اب میں باہر جانا ہی چھوڑ دوں گی۔''

رما بھی اسی فکر میں غرق تھے، پر اس کا اظہار کر کے جالپا کی مسرت میں کیسے رخنہ ڈالتا۔ بولا۔ ''سب ادا ہو جائے گا۔''

جالپا نے ترش ہو کر کہا۔ ''کہاں سے ادا ہو جائے گا۔ ذرا سنوں؟ کوڑی تو بچتی نہیں، ادا کہاں سے ہو جائے گا۔ ان چیزوں کو لوٹا آؤ۔''

رما نے منت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ان چیزوں کو رکھ لو۔ پھر تم سے بغیر پوچھے نہ لاؤں گا۔''

شام کو جالپا نے نئی ساڑھی پہنی، گھڑی کلائی پر باندھی اور آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو غرور اور مسرت سے اس کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے ان چیزوں کو واپس کرنے کے لیے خواہ سچے دل سے اصرار کیا ہو، پر اس وقت وہ اتنی نفس کشی کے لیے تیار نہ تھی۔ شام کو جالپا اور رما چھاؤنی کی طرف چلے۔ اس خاتون کا بنگلہ ملنے میں دیر نہ ہوئی۔ پھاٹک پر سائن بورڈ تھا ''اندر بھوشن ایڈووکیٹ'' اب معلوم ہوا، وہ ان وکیل صاحب کی بیوی تھی۔ پنڈت جی یہاں کے نامی وکیل تھے۔ رما نے انہیں کئی بار دیکھا تھا، لیکن اتنے بڑے آدمی سے اس کے ذاتی مراسم کیا ہوتے، چھ مہینے پہلے وہ اس کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا کہ کبھی وہ ان کے یہاں مدعو ہو گا، مگر جالپا کی بدولت وہ اعزاز بھی اسے حاصل ہو گیا۔ اس وقت وہ شہر کے سب

سے بڑے وکیل کا مہمان تھا۔

رما نے سوچا تھا یہاں بہت سے آدمیوں کی دعوت ہو گی۔ مگر یہاں وکیل صاحب اور ان کی بیوی کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی باہر نکل آئی اور انہیں اندر لے جا کر اپنے شوہر سے ان کا تعارف کرایا۔ پنڈت جی نے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے دونوں مہمانوں سے ہاتھ ملایا اور رما سے بولے۔ ''معاف کیجیے گا بابو صاحب میری طبیعت اچھی نہیں ہے، یہاں آپ کس دفتر میں ہیں؟''

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں میونسپل آفس میں ہوں۔ ابھی حال ہی میں آیا ہوں۔ قانون کی طرف جانے کا ارادہ تھا لیکن یہاں نئے وکیلوں کی حالت دیکھ کر ہمت نہ پڑی۔''

رما نے اپنا وقار بڑھانے کے لیے تھوڑا سا جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اثر خاطر خواہ ہوا۔ اگر وہ صاف کہہ دیتا، میں پچیس روپے کا کلرک ہوں تو شاید وکیل صاحب اس سے ہم کلام ہونے میں اپنی توہین سمجھتے۔ مسکرا کر بولے۔ ''آپ نے بہت اچھا کیا جو ادھر نہیں آئے۔ دو چار سال کے بعد آپ کسی اچھے عہدے پر پہنچ جائیں گے۔ یہاں ممکن ہے تب تک آپ کو کوئی مقدمہ ہی نہ ملتا۔''

جالپا کو ابھی تک شبہ ہو رہا تھا کہ رتن وکیل صاحب کی لڑکی ہے یا بیوی؟ وکیل صاحب کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ چکنی چاند آس پاس کے سفید بالوں کے بیچ میں وارنش کی ہوئی لکڑی کی طرح چمک رہی تھی۔ مونچھیں صاف تھیں، لیکن ماتھے کے شکن اور گالوں کی جھریاں بتا رہی تھیں، مسافر منزل کے قریب پہنچ گیا ہے۔

مریض آرام کرسی پر لیٹے ہوئے وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے برسوں کا مریض ہو۔ہاں رنگ گورا تھا، جو ساٹھ سال کی گرمی اور سردی کھا کر بھی نہ اڑ سکا تھا۔اونچی ناک تھی۔اونچی پیشانی اور بڑی بڑی آنکھیں، جن میں غرور لبریز تھا۔اس کے برعکس رتن سانولی، ملیح اور بھرے ہوئے بدن کی عورت تھی۔نہایت ملنسار اور خنداں پیشانی، جسے غرور چھو تک نہ گیا تھا۔اس کی شکل میں حسن کی کوئی علامت نہ تھی۔ناک چپٹی تھی۔چہرہ گول۔آنکھیں چھوٹی پھر بھی وہ رانی سی لگتی تھی۔جالپا اس کے سامنے ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے سورج مکھی کے سامنے جوہی کا پھول۔

چائے آئی۔میوے، پھل، مٹھائی، برف کی قلفی سب میزوں پر چن دی گئی۔ رتن اور جالپا ایک میز پر بیٹھیں۔دوسری میز رما اور وکیل صاحب کی تھی۔رما اپنی جگہ پر جا بیٹھا، مگر وکیل صاحب ابھی آرام کرسی پر لیٹے ہوئے تھے۔

رما نے مسکرا کر وکیل صاحب سے کہا۔''آپ بھی تو آیئے۔''

وکیل صاحب نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔''آپ شروع کیجیے، میں بھی آ جاتا ہوں۔''

ان لوگوں نے چائے پی، پھل کھائے، مگر وکیل صاحب کے سامنے ہنستے بولتے رما اور جالپا دونوں ہی جھجکتے تھے۔زندہ دل بوڑھوں کے ساتھ تو صحبت کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا، لیکن ایسے روکھے، سرکہ جبیں بے جان آدمی جواں بھی ہوں تو دوسرے کو افسردہ دل بنا دیتے ہیں۔وکیل صاحب نے بہت اصرار کرنے پر دو گھونٹ چائے پی۔دور سے بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔اس لیے جب رتن نے جالپا سے کہا۔''چلو ہم لوگ ذرا باغیچہ کی سیر کر آویں۔ان دونوں صاحبوں کو قانون اور

اخلاق کی بحث کرنے دیں، تو گویا جالپا کے گلے کا پھندہ کھل گیا۔ رما نے پنجرے میں بند طائروں کی طرح ان دونوں کو کمرے سے نکلتے دیکھا اور ایک لمبی سانس لی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مصیبت اس کے سر آئے گی تو یہاں آنے کا نام نہ لیتا۔

وکیل صاحب نے منہ سکوڑ کر پہلو بدلا، اور بولے۔ ''معلوم نہیں کہ پیٹ میں کیا ہو گیا ہے کہ کوئی چیز ہضم ہی نہیں ہوتی۔ دودھ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ چائے کو نہ جانے لوگ اتنے شوق سے پیتے ہیں۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ پیتے ہی جسم میں اینٹھن سی ہونے لگتی ہے۔ اور آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔''

رما نے پوچھا۔ ''آپ نے ہاضمہ کی دوا نہیں لی؟''

وکیل صاحب نے بے رخانہ انداز سے کہا۔ ''دوائیوں پر مجھے ذرہ بھر بھی اعتبار نہیں۔ ان ویدوں اور ڈاکٹروں سے زیادہ کج فہم آدمی دنیا میں نہ ملیں گے۔ کسی میں بھی تشخیص کا مادہ نہیں۔ کبھی بھی ویدوں یا ڈاکٹروں کی تشخیص یکساں نہ ہو گی۔ علامتیں وہی ہیں۔ مگر ایک وید خون کا فساد بتلاتا ہے، دوسرا صفرا کا۔ ایک ڈاکٹر پھیپھڑے کا آماس بتلاتا ہے تو دوسرا معدے کا سرطان۔ بس قیاس سے دوا کی جاتی ہے اور بے رحمی سے مریضوں کی گردن پر چھری پھیری جاتی ہے۔ ان ڈاکٹروں نے تو اب تک مجھے جہنم میں پہنچا دیا ہوتا۔ پر کسی طرح ان کے پنجے سے نکل کر بھاگا۔ یوگ کے علم کی بڑی تعریف سنتا ہوں، لیکن ایسا مہاتما نہیں ملتا، جس سے کچھ سیکھ سکوں۔''

ادھر تو فن طب پر اعتراضات ہو رہے تھے اور ادھر دونوں حسینوں میں راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں۔ رتن نے مسکرا کر کہا

''وکیل صاحب کو دیکھ کر تمہیں بڑا تعجب ہوا ہوگا۔ میں ان کی دوسری بیوی ہوں۔ پہلی بیوی کو مرے پینتیس سال ہو گئے۔ اس وقت ان کی عمر پچیس سال کی تھی۔ لوگوں نے سمجھایا دوسری شادی کر لو۔ لیکن ایک لڑکا موجود تھا۔ شادی کرنے سے انکار کر دیا اور تیس سال تنہا رہے۔ مگر آج پانچ سال ہوئے، بیٹے کا انتقال ہو گیا۔ تب دوسری شادی کی فکر ہوئی۔ میرے ماں باپ نے تھے۔ ماموں نے میری پرورش کی تھی۔ کہہ نہیں سکتی کہ ان سے کچھ لے لیا یا ان کی شرافت پر ترجیح گئے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایشور کی یہی مرضی تھی۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ بس اگر کوئی شکایت ہے تو یہی کہ میں روز بروز موٹی ہوتی چلی جاتی ہوں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ تمہیں اولاد نہیں ہو سکتی۔ بہن! مجھے تو اولاد کی آرزو نہیں، لیکن وکیل صاحب نے اولاد کے لیے ہی شادی کی تھی۔ میری یہ حالت دیکھ کر انہیں بہت رنج ہوتا ہے۔ میں ہی ان کی ساری شکایتوں کی جڑ ہوں۔ آج ایشور مجھے ایک لڑکا دے دے، ان کے سارے روگ بھاگ جائیں۔ کتنا چاہتی ہوں کہ دبلی ہو جاؤں۔ گرم پانی سے ٹب اشنان کرتی ہوں۔ روز پیدل گھومنے جاتی ہوں۔ گھی، دودھ بہت کم کھاتی ہوں۔ خوراک بھی کم کر دی ہے۔ جتنی محنت کر سکتی ہوں، کرتی ہوں۔ پھر بھی دن بدن موٹی ہوتی جاتی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں؟''

جالپا نے پوچھا۔ ''وکیل صاحب تم سے ناراض رہتے ہوں گے؟''

رتن نے کہا۔ ''نہیں بہن بالکل نہیں۔ کبھی بھول کر بھی مجھ سے اس کا چرچا نہیں کیا۔ شکایت کا کبھی ایک حرف بھی میں نے ان کی زبان سے نہیں سنا۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ یہ فکر انہیں گھلائے ڈالتی ہے۔ اپنا کوئی قابو نہیں ہے۔ کیا کروں؟ میں

جتنا چاہوں خرچ کروں جیسے چاہوں رہوں، کبھی نہیں بولتے۔ جو کچھ پاتے ہیں، لا کر میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہیں۔ میں نے کئی بار کہا کہ اب تمہیں وکالت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آرام کیوں نہیں کرتے؟ مگر ان سے بیٹھے رہا نہیں جاتا۔ صرف دو چپاتیوں سے ناتا ہے۔ میں نے بہت ضد کی تو دو چار دانے انگور کے کھا لیے۔ مجھے تو ان پر رحم آتا ہے۔ جو خدمت اپنے امکان میں ہے، وہ کرتی ہوں۔ آخر وہ میرے ہی لیے تو اپنی جان کھپا رہے ہیں۔''

جالپا نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''ایسے نیک نفس آدمی کو تو دیوتا سمجھنا چاہیے۔ تیس سال تک تنہا رہنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔''

رتن: ''ہاں بہن! ہیں تو دیوتا ہی۔ اب بھی کبھی پہلی بیوی کی یاد آ جاتی ہے تو رونے لگتے ہیں۔ دیکھنے میں جتنے روکھے معلوم ہوتے ہیں، اندر سے اتنے ہی نرم ہیں۔ یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے باندھ رکھے ہیں۔ تمہارا یہ کنگن تو بڑا خوشنما ہے۔''

جالپا: ''ہاں، ہوشیار کاریگر نے بنایا ہے۔''

رتن: ''میں تو یہاں کسی کو جانتی نہیں۔ وکیل صاحب کو تکلیف دینے کو جی نہیں چاہتا۔ معمولی سناروں سے بنواتے ڈر لگتا ہے۔ نہ جانے کیا ملا دیں۔ تم اپنے بابو جی سے میرے لیے ایسا ہی ایک جوڑا کنگن بنوا دو۔''

جالپا نے کنگن بنوانے کا وعدہ کیا۔

رتن: ''آج تمہارے آنے سے طبیعت بہت خوش ہوئی۔ دن بھر اکیلی پڑی رہتی ہوں۔ کس کے پاس جاؤں؟ دو ایک عورتوں سے راہ و رسم بڑھائی۔ چاہا کہ

ان سے بہنا پا جوڑوں، لیکن ان کے رنگ ڈھنگ دیکھ دیکھ کر ان سے دور رہنا ہی اچھا معلوم ہوا۔ شوق کی چیزوں پر ایسا ٹوٹتی تھیں کہ دیکھ کر شرم آتی تھی۔ تم گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے روز چلی آیا کرو۔''

جالپا: ''واہ یہ تو میرے دل کی بات ہوئی۔''

رتن: ''میں موٹر بھیج دیا کروں گی۔''

''کیا ضرورت ہے؟ تانگے تو ملتے ہی ہیں؟''

''نہ جانے کیوں تمہیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا؟ تمہیں پا کر رمانا تھ اپنی تقدیر کو سراہتے ہوں گے؟''

جالپا مسکرا کر بولی۔ ''تقدیر تو نہیں سراہتے، گھر کیاں جمایا کرتے ہیں۔''

اسی اثنا میں رمانا تھ بھی وہاں آ پہنچا۔ جالپا نے اس سے نگن کا ذکر کیا۔

رمانا تھ نے سرخرو ہونے کا موقع پا کر کہا۔ ''ہاں بنوا دوں گا۔ اس سے بہت اچھے بن سکتا ہے۔''

رتن نے پوچھا۔ ''اس جوڑے کے کیا لیے تھے؟''

جالپا: ''آٹھ سو کے تھے۔''

رتن: ''کوئی ہرج نہیں۔ مگر بالکل ایسے ہی ہوں۔ اسی نمونے کے۔''

رما: ''ہاں، بنوا دوں گا۔''

رتن: ''مگر بھائی ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

روپے کے معاملے میں عورتوں کے سامنے مردوں کی زبان بند ہو جاتی ہے۔ کیا وہ کہہ سکتا تھا، اس وقت میرے پاس بھی روپے نہیں ہیں۔ یہ عذر وہ کسی حالت

میں بھی نہ کر سکتا تھا۔ چاہے اسے دوسروں سے قرض لینا پڑے۔ دوسروں کی خوشامد کرنی پڑے، مگر ایک حسینہ کے روبرو اپنی مجبوری کا اظہار نہ کرے گا۔ شاید اس نے کوئی عذر کیا ہوتا تو جالپا کو بھی برا معلوم ہوتا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں حضرت عذر نہ کر بیٹھیں، اس لیے جب رما نے دلیرانہ انداز سے کہا کہ روپے کی کوئی بات نہیں، جب چاہے دے دیجیے تو وہ خوش ہوگئی۔

رتن: ''تو کب تک امید کروں؟''

رما: ''میں آج ہی صراف سے کہہ دوں گا، زیادہ سے زیادہ دو ہفتے سمجھئے۔''

جالپا نے رتن کو اپنے گھر چائے کی دعوت دی اور دونوں گلے مل کر بدا ہوئیں۔ گھر پہنچے تو شام ہوگئی تھی۔ رمیش بابو بیٹھے ہوئے تھے۔ جالپا تو اتر کر اندر چلی گئی۔ رما، رمیش بابو کے پاس جا کر بولا۔ ''آپ کو آئے ہوئے دیر ہوئی؟''

رمیش: ''ابھی تو چلا آ رہا ہوں۔ وکیل صاحب کے یہاں دعوت تھی؟''

رما: ''جی ہاں، تین روپے کی چپت پڑ گئی۔''

رمیش: ''کوئی ہرج نہیں، یہ روپے وصول ہو جائیں گے۔ بڑے آدمیوں سے راہ و رسم پیدا ہو جائے تو بڑے بڑے کام نکلتے ہیں۔''

رما: ''اب کی اتوار کو انہیں بھی چائے کی دعوت دے آیا ہوں۔''

رمیش نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ''تب تو یہ کہو کہ تم سے یارانہ ہوگیا۔ کہو تو میں بھی آ جاؤں۔ سنا ہے وکیل صاحب کے ایک بھائی انجینئر ہیں۔ میرے ایک سالے بہت دنوں سے بیکار بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر وکیل صاحب اس کی سفارش کر دیں تو غریب کو جگہ مل جائے، تم ذرا انٹروڈکشن کرا دینا۔ باقی اور سب میں کرا لوں گا۔

پارٹی کا انتظام ایشور نے چاہا تو ایسا ہو گا کہ وہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ سارا انتظام میرے اوپر چھوڑ دو۔ نہ قلی کی ضرورت، نہ مزدور کی، انہیں موسل چند کو پھانسوں گا۔''

رما: ''ابھی دو تین مہینے ہوئے۔ آپ نے انہیں ایک جگہ تو دلا دی تھی؟''

رمیش: ''اجی ابھی چھ اور باقی ہیں۔ پورے سات آدمیوں کی پلٹن ہے۔ ذرا بیٹھ جاؤ ضروری چیزوں کی فہرست بنالی جائے۔ کتنے مہمان ہوں گے۔''

رما: ''بس وکیل صاحب ہوں گے اور ان کی بیوی۔''

رمیش: ''یہ بہت اچھا کیا۔ اس طرح اپنے عرض حال کا اچھا موقع رہے گا۔ دونوں آدمیوں نے بیٹھ کر ایک لمبی فہرست تیار کی اور دوسرے ہی دن سے رمیش بابو نے سامان بہم پہنچانا شروع کیا۔ ان کی رسائی اچھے اچھے گھروں میں تھی۔ آرائش کی ایسی نفیس چیزیں فراہم کر کے لائے کہ سارا گھر جگمگا اٹھا۔ منشی دیانا تھ بھی ان تیاریوں میں شریک تھے۔ چیزوں کو قرینے سے سجانا ان کا کام تھا۔ کون سا گملا کہاں رکھا جائے۔ کونسی تصویر کہاں لٹکائی جائے۔ کون سا قالین کہاں بچھایا جائے۔ ان مسائل پر تینوں آدمیوں میں گھنٹوں مناظرے ہوئے تھے۔ دفتر جانے سے پہلے اور دفتر سے آنے کے بعد تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ ایک دن اسی بات پر بحث چھڑ گئی کہ کمرے میں آئینہ کہاں رکھا جائے۔ ان مسائل پر تینوں اسی کام میں لگ جاتے۔ دینا ناتھ کہتے تھے کہ اس کمرے میں آئینے کی ضرورت نہیں۔ آئینہ پیچھے والے کمرے میں رکھنا چاہیے۔ رمیش کو اس سے اختلاف تھا اور رما دبدھے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔ نہ ان کی سی کہہ سکتا تھا، نہ ان کی سی سن سکتا تھا۔

دیاناتھ نے گرم ہو کر کہا۔ ''میں نے سینکڑوں انگریزوں کے ڈرائنگ روم دیکھے ہیں، مگر کہیں آئینہ نہیں دیکھا۔ آئینہ غسل خانے میں رکھنا چاہیے۔ یہاں آئینہ رکھنا بے تکی سی بات ہے۔''

رمیش نے اتنی سرگرمی سے جواب دیا۔ ''مجھے اتنے انگریزوں سے سابقہ تو نہیں پڑا، لیکن دو چار بنگلے دیکھے ضرور ہیں اور ان میں آئینہ لگا ہوا دیکھا۔ پھر اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ ہر ایک بات میں انہی کی نقل کریں؟ ہم انگریز نہیں، ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانی رؤسا کے کمرے میں بڑے بڑے قد آدم آئینے لگے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ نے ہمارے بگڑے ہوئے بابوؤں کی سی بات کہی، جو آرائش و لباس میں رفتار و گفتار میں، چائے و شراب میں غرض نمائش کی سبھی باتوں میں انگریزوں کا منہ چڑاتے ہیں، لیکن جن باتوں نے انگریزوں کو انگریز بنا دیا ہے اور جن کی بدولت وہ دنیا پر حکومت کرتے ہیں، ان کی ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ کیا آپ کو بھی بڑھاپے میں انگریز بننے کا شوق چرایا ہے؟''

دیاناتھ انگریزوں کی نقل کو بہت معیوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوٹ نہیں پہنا تھا۔ چائے پیتے تھے، مگر چینی کے سیٹ کی قید نہ تھی۔ کٹورا، کٹوری، گلاس لوٹا، تسلا غرض کسی سے بھی اعتراض نہ تھا۔ لیکن اس وقت تو انہیں بحث کی دھن سوار تھی۔ بولے۔ ''ہندوستانی رئیسوں کے کمروں میں میز کرسیاں نہیں ہوتیں۔ فرش ہوتا ہے۔ آپ نے کرسی میز لگا کر اسے انگریزی طرز پر تو سجا دیا۔ آپ آئینہ کے ذریعے ہندوستان کی مثال لے رہے ہیں یا ہندوستانی رکھیے یا انگریزی۔ یہ کیا کہ آدھا تیتر، آدھا بٹیر۔ کوٹ پتلون پر چوگوشیہ ٹوپی تو اچھی نہیں

معلوم ہوتی۔''

رمیش بابو نے سمجھا تھا کہ دیاناتھ لاجواب ہو جائیں گے، لیکن یہ جواب سنا تو چکرا گیا۔ میدان ہاتھ سے جاتا ہوا دکھائی دیا، بولے۔ ''تو آپ نے کسی انگریز کے کمرے میں آئینہ نہیں دیکھا۔ بھلا ایسے دس پانچ انگریزوں کے نام تو بتایئے۔''

''ایک آپ کا ہی کرنٹا ہیڈ کلرک ہے، اس کے سوا اور کسی انگریز کے کمرے میں تو آپ نے قدم بھی رکھا ہو گا۔ اس کرنٹے کو آپ نے انگریزی مذاق کا نمونہ سمجھ لیا۔ خوب مانتا ہوں۔''

دیاناتھ کچھ خفیف ہو کر بولے۔ ''یہ تو آپ کی زبان ہے۔ اسے کرنٹا چمڑ پیشن، پلپلی جو چاہیں کہیں، لیکن رنگ کو چھوڑ کر وہ کسی بات میں انگریزوں سے کم نہیں۔''

رمیش اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک موٹر کار دروازے پر آ کر رکی اور رتن برآمدے میں داخل ہوئی۔ تینوں آدمی چٹ پٹ باہر نکل آئے۔ رما کو اس وقت رتن کا آنا برا معلوم ہوا۔ ڈر رہا تھا کہ کہیں کمرے میں نہ چلی جائے۔ نہیں تو ساری قلعی کھل جائے۔ آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتا ہوا بولا:

''آیئے! یہ میرے والد ہیں اور یہ میرے دوست رمیش بابو ہیں'' لیکن ان دونوں بھلے آدمیوں نے اس سے ہاتھ ملایا اور نہ اپنی جگہ سے ہلے۔ رتن نے بھی ان سے ہاتھ ملانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ دور ہی سے نمسکار کر کے رما سے بولی:

''میں بیٹھوں گی نہیں۔ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ آپ سے کچھ کہنا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ رما کے ساتھ موٹر تک آئی اور آہستہ سے بولی:

''آپ نے صراف سے تو کہہ دیا ہو گا۔''

رما نے برجستہ کہا: ''جی ہاں، بنا رہا ہے۔''

رتن: ''اس دن میں نے کہا تھا کہ روپے نہ دے سکوں گی۔ پھر خیال آیا، آپ کو تکلیف ہوگی۔ اس لیے روپیہ کا انتظام کر لیا۔ آٹھ سو چاہیے نا؟''

جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتائے تھے۔ رما چاہتا تو اتنے روپے لے سکتا تھا، لیکن رتن کی سادگی اور بے تکلفی نے جیسے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ بیوپاریوں سے دو دو چار آنے لیتے ذرا بھی نہ جھجکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب بھی گاہکوں کو مونڈتے ہیں۔ ایسوں کے ساتھ اسے اپنے طرزِ عمل میں کسی طرح تامل نہ ہوتا تھا، لیکن اس شرافت اور اخلاق کی دیوی سے دغا کرنے کے لیے کسی پرانے پاپی کی ضرورت تھی۔ کچھ شرماتا ہوا بولا:

''کیا جالپا نے کنگن کے دام آٹھ سو بتلائے تھے۔ انہیں شاید یاد نہ رہی ہوگی۔ ان کے کنگن چھ سو کے ہیں۔ آپ چاہیں تو آٹھ سو کے بنوا دوں۔''

رتن: ''نہیں مجھے تو وہی پسند ہے، آپ چھ سو کا ہی بنوائیے۔''

اس نے موٹر میں سے اپنی تھیلی اٹھا کر سو سو روپے کے چھ نوٹ نکالے۔ رما نے کہا:

''ایسی جلدی کیا تھی، چیز تیار ہو جاتی تو حساب ہو جاتا؟''

رتن نے موٹر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس خرچ ہو جاتے اس لیے میں نے سوچا آپ کے سر پر لاد آویں۔ میری عادت ہے کہ جو کام کرتی ہوں، جلد سے جلد کر ڈالتی ہوں۔ تاخیر سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔''

موٹر چلی گئی۔ رما روپیہ لیے اندر چلا گیا تو دونوں بڈھوں میں باتیں ہونے

لگیں۔

رمیش: ''دیکھا؟''

دیاناتھ: ''آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اب میرے گھر میں بھی یہی لہر آ رہی ہے۔''

رمیش: ''میں تو اس میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا۔ آج کل ایسی ہی عورتوں کا کام ہے۔ ضرورت پڑنے پر کچھ مدد تو کر سکتی ہیں۔ بیمار پڑ جاؤ تو ڈاکٹر کو تو بلا سکتی ہیں۔ یہاں تو چاہے مر بھی جائیں لیکن مجال کہ عورت گھر سے پاؤں نکالے۔''

دیاناتھ: ''ہم سے تو بھائی یہ انگریزیت نہیں دیکھی جاتی۔ کیا کریں اولاد کی محبت ہے، نہیں تو یہی جی چاہتا ہے کہ رما سے صاف کہہ دوں بھیا! اپنا گھر الگ لے کر رہ۔ آنکھ پھوٹی پیڑ گئی۔ دیکھ ایک دن یہ عورت وکیل صاحب کو دغا دے گی۔''

رمیش: ''آپ یہ کیوں مان لیتے ہیں کہ جو عورت باہر آتی جاتی ہے وہ ضرور خراب ہے، مگر رما ناتھ کو مانتی بہت ہے۔ روپے نہ جانے کیوں دیئے؟''

دیاناتھ: ''مجھے تو کچھ دال میں کالا نظر آتا ہے۔ رما کہیں اس سے کوئی چال نہ چل رہا ہو؟''

رما اندر سے آ رہا تھا۔ یہ آخری جملہ اس کے کان میں پڑ گیا۔ ترش ہو کر بولا۔ ''جی ہاں! ضرور چال چل رہا ہوں۔ اسے دھوکہ دے کر روپے اینٹھ رہا ہوں۔ یہی تو میرا پیشہ ہے۔''

دیاناتھ نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''تو اتنا بگڑتے کیوں ہو؟ میں نے تو کوئی

ایسی بات نہیں کہی۔''

رما: ''جعلساز بنا دیا اور زیادہ کیا کہتے۔ آخر آپ کے دل میں ایسا شبہ کیوں آیا؟ آپ نے مجھ میں کون سی ایسی برائی دیکھی جس سے یہ خیال پیدا ہوا؟ میں ذرا صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں۔ ذرا نئی تہذیب کا پیرو ہوں۔ اس کے سوا آپ نے مجھ میں کون سی برائی دیکھی، جس سے یہ خیال پیدا ہوا میں جو کچھ خرچ کرتا ہوں، ایمانداری کے ساتھ کما کر خرچ کرتا ہوں۔ جس دن دھوکے اور فریب کی نوبت آئے گی، زہر کھا کر جان دے دوں گا۔ ہاں یہ بات ہے کہ کسی کو خرچ کرنے کی تمیز ہوتی ہے، کسی کو نہیں ہوتی۔ جب آپ کے دل میں میرے متعلق ایسے شبہے پیدا ہونے لگے تو میرے لیے اس کے سوا اور کیا چارہ ہے کہ میں کالک لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ رمیش بابو یہاں موجود ہیں، آپ میری غیبت میں میرے متعلق جو کچھ چاہیں ان سے پوچھ سکتے ہیں۔ یہ میری خاطر جھوٹ نہ بولیں گے۔''

رما نے یہ الفاظ کچھ اس صداقت انگیز جوش کے ساتھ کہے کہ منشی دیانا تھ کے سارے شبہات حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔ نادم ہو کر بولے۔ ''تمہارا بڑھتا ہوا خرچ دیکھ کر میرے دل میں شبہ ہوا تھا۔ میں اسے چھپاتا نہیں، لیکن جب تم کہہ رہے ہو کہ تمہاری نیت صاف ہے تو مجھے اطمینان ہے۔ میری صرف یہی منشا ہے کہ میرا لڑکا چاہے غریب رہے، مگر نیت درست رکھے۔''

رمیش نے مسکرا کر کہا۔ ''اچھا یہ قصہ تو ہو چکا۔ اب یہ بتاؤ اس نے تمہیں روپے کیوں دیئے؟''

رما: ''ٹھگ لایا ہوں۔''

رمیش: ''مجھ سے شرارت کرو گے تو کان پکڑ لوں گا۔ اگر ٹھگ ہی ائے ہو تو بھی میں تمہاری پیٹھ ٹھونکوں گا۔ جیتے رہو۔ خوب ٹھگو لیکن آبرو پر آنچ نہ آنے پائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایشور سے تو میں ڈرتا نہیں، وہ جو کچھ پوچھے گا اس کا جواب میرے پاس موجود ہے۔ مگر آدمی سے ڈرتا ہوں۔ سچ بتاؤ کس لیے روپے دیئے۔ کچھ دلالی ملنے والی ہو تو مجھے بھی شریک کر لینا۔''

رما نے اس طرح منہ بنا کر کہا گویا کوئی ناگوار فرض اس کے سر پر ڈال دیا گیا ہے۔ ''ایک کنگن بنوانے کو کہہ گئی ہیں۔''

رمیش: ''تو چلو میں ایک اچھے صراف سے بنوا دوں، مگر یہ جھنجھٹ تم نے برا مول لیا۔ عورتوں سے ایشور بچائے۔ تم چاہے دس پانچ روپے اپنے پاس سے ہی خرچ کر دو۔ وہ یہی سمجھیں گی کہ مجھے لوٹ لیا۔''

ذرا دیر بعد رما اندر جا کر جالپا سے بولا۔ ''رتن دیوی کنگن کے روپے دے گئیں۔ تم نے شاید آٹھ سو بتائے تھے۔ میں نے چھ سو لے لیے۔''

جالپا نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں نے تو دل لگی کی تھی۔''

جالپا نے اس طرح اپنی صفائی تو دے دی، لیکن بہت دیر تک اس کا دل اسے ملامت کرتا رہا۔ رما نے اگر آٹھ سو روپے لے لیے ہوتے تو شاید وہ اپنی کامیابی پر خوش ہوئی ہوتی، لیکن رما کی حق شناسی نے اس کے ضمیر کو بیدار کر دیا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی۔ ناحق جھوٹ بولی۔ مجھے دل میں کتنا حقیر سمجھ رہے ہوں گے اور رتن نے دغاباز سمجھ ہی لیا۔

چائے پارٹی میں کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ رتن کے ساتھ ان کی ایک رشتہ کی بہن اور تھی۔ وکیل صاحب نہ آئے تھے۔ دیا ناتھ نے اتنی دیر کے لیے وہاں سے ٹل جانا ہی مناسب سمجھا۔ ہاں رمیش بابو برآمدے کے برابر کھڑے رہے۔ جالپا کی موجودگی میں وہ پارٹی میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔

جالپا نے دونوں مہمانوں کو اپنی ساس سے ملایا۔ جاگیشری کو وہ دونوں ضرورت سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوئیں۔ ان کا سارے گھر میں دوڑنا۔ دھم دھم کر کے کوٹھے پر جانا۔ چھت پر ادھر ادھر اچکنا۔ قہقہے مار مار کر ہنسنا، انہیں ہڑ دنگا پن معلوم ہوتا تھا۔ ان کے آئین اخلاق میں بہو بیٹیوں کو متین اور شرمیلی ہونا چاہیے تھا۔ تعجب یہ تھا کہ جالپا بھی آج انہی میں مل گئی تھی۔

ابھی تک رما کو پارٹی کی تیاریوں میں سے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ گنگو کی دکان پر جاتا۔ اس نے سمجھا تھا گنگو کو چھ سو روپے پچھلے حساب میں دے کر نئے کنگن بنوالوں گا۔ اس طرح میرا وقار جم جائے گا۔

دوسرے دن رما خوش ہوتا ہوا گنگو کی دکان پر پہنچا اور رعب سے بولا۔ ''کیا رنگ ڈھنگ ہیں مہاراج! کوئی نئی چیز بنوائی ہے؟'' ادھر رما کے ٹال مٹول سے گنگو اتنا بے دل ہو رہا تھا کہ آج کچھ روپے ملنے کی امید بھی اسے خوش نہ کر سکی۔ شکوہ آمیز انداز سے بولا۔ ''بابو صاحب چیزیں کتنی بنیں بکیں۔ آپ نے تو دکان پر آنا ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح کی دکانداری ہم نہیں کرتے۔ آٹھ مہینے ہوئے، آپ کے یہاں سے ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔''

رما: ''بھائی خالی ہاتھ دکان پر آتے شرم آتی تھی۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں